

کالے کوس از بلونت سنگھ: تقسیم ہند کے خونچکاں مناظر کا عکاس
جمیل حیات

ABSTRACT:

After partition many writers wrote about the situation and problems created after partition, eg: migration, administration problems and the culture which those writer left behind. The literature which is written in that era was full of the remembrance of past. BALWANT SINGH is one of a great urdu novelist who wrote a remarkable novel "KALAY KOS" in which he presented the beautiful picture of PUNJAB especially SHEKHOPURA of that era. He told that hindu, sikh and muslim were the culprits of that bloody situation which faced the innocent people of different religions. He also painted the beautiful picture of romance and friendship. In this article I tried to explain the importance of "kalay kos" and also I have made a linguistic analysis of this novel.

فسادات اور نئے سماجی ماحول کے بارے میں ناول نگاروں کا جذباتی ردِ عمل ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے۔ کچھ نے تو سچی تصویر کشی کی لیکن کچھ اس طرح کہ ہو بہ ہو جیسا دیکھا ویسا لکھ دیا، کچھ نے تخیل اور چند ایک نے چھپے ہوئے ہوئے محرکات کو اپنی تحریر میں پیش کیا۔ بہت سے ناول نگاروں کے ہاں فسادات کی منظر کشی میں جذبات کی شدت محسوس ہوتی ہے۔ عقیل احمد لکھتے ہیں:

”ابھی تک اردو کا افسانوی ادب تقسیم ہند کے موضوع سے فکر و فن دونوں سطحوں پر باہر نہیں نکل سکا اور کسی نہ کسی طرح یہ موضوع کہانیوں اور ناولوں پر غالب ہے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تقسیم ہند نے ایک طرف مذہبی منافرت کو جنم دیا اور یہ منافرت آج تک نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قائم ہے بلکہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں دن بدن نئے روپ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اور تہذیب اور تمدن حتیٰ کہ عام سماجی رشتوں تک میں بھی زہر گھولتی جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ ایک اہم اقتصادی مسئلہ بھی ہے۔ تقسیم ہند کی اقتصادی بنیادیں بھی تھیں۔“ [۱]

۱۹۴۷ء کے بعد کے عہد میں تمام اصنافِ ادب میں تقسیم ہند کے اثرات نظر آتے ہیں چونکہ ناول سماج میں پیش آنے والی تبدیلیوں کا زیادہ بہتر اظہار کر سکتا ہے اور اپنے زمانے کی حقیقی اور طور طریقوں کی تصویر ہوتا ہے اس لیے تقسیم کے بعد اردو ناول نے بھی ایک نیا موڑ لیا۔ آزادی کے بعد ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات میں تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات، نقل مکانی اور نئے سماجی مسائل کا ذکر کیا۔

تقسیم بند کے بعد لکھے گئے ناولوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے والے ناول شدید جذباتیت پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں میں اعلیٰ ادب تلاش نہیں کیا جا سکتا البتہ انسانی وحشت و بربریت کی تصویر کشی مل سکتی ہے۔ ان ناولوں میں مہاجرین کی کرب ناک حالت کی عکاسی کی گئی ہے جیسا کہ ایم اسلم کا ”رقص ابلیس“، قیس رامپوری کا ”خون“ اور ”آبرو“ اور رئیس احمد جعفری کا ”مجاہد“ اور ”پچاس ہزار عورتیں“ وغیرہ دوسری قسم کے ناولوں میں فسادات کی جذباتی تصویر کم نظر آتی ہے یہ ناول تقسیم کے محرکات، کانگریس اور مسلم لیگ کا کردار، ہندوئوں اور سکھوں کا مسلمانوں سے سلوک اور مہاجرین کے مسائل کی تفصیل سمیٹتے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ خدیجہ مستور کے ناول ”آنگن“ اور ”زمین“، جمیلہ ہاشمی کا ”تلاش بہاراں“، نسیم حجازی کا ”خاک اور خون“، عبد اللہ حسین کا ”اداس نسلیں، انتظار حسین کا ”بستی“، ”تذکرہ“ اور ”آگے سمندر ہے“ وغیرہ۔

جو ادیب بھارت سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے انہوں نے ماضی پرستی کا تذکرہ ادبی رنگ میں کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد افضال بٹ لکھتے ہیں:

”وہ اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں اور چھوڑی ہوئی بستیوں کا ذکر کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں ماضی کے کھنڈروں کو بڑی محبت اور خلوص سے سجایا۔ انہوں نے تاریخ، مذہب، تہذیب و ثقافت اور سماجی شعور سے اپنے ناولوں میں علامتی نظام قائم کیا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم کے بعد کے ناولوں میں تقسیم بند، ہجرت، زوال پذیر تہذیب اور اخلاقی قدروں کو بھر پور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔“ [۲]

قیام پاکستان کے بعد فسادات کا المیہ اور ہجرت کا کرب نمایاں نظر آتا ہے۔ اس چیز نے پاک و ہند میں معاشرتی ناہمواری اور عدم توازن کو فروغ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ مہاجرین کو نئی سرزمین پر بہت سے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ چنانچہ ناول نگار نے اس بات کو بھی مد نظر رکھا اور فسادات کے بعد جس موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی وہ ہجرت کا کرب، اسلاف کی سرزمین اور مخصوص تہذیب و ثقافت سے بچھڑنے کا غم تھا۔ شہزاد احمد منظر لکھتے ہیں:

”پاکستان کے افسانوں اور ناولوں میں ہجرت کے کرب کا اظہار ان ادیبوں نے کیا جو ہجرت کر کے نئے ملک پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے ہجرت تو کی مگر اپنی یادوں میں آبائی وطن کو بسائے رکھا یہ بات خاص طور پر ہندوستان سے آئے ہوئے ادیبوں کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ یہ کرب از وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب انہیں اور ان کی طرح دوسرے لوگوں کو ان کی امیدوں اور خوابوں کی سرزمین پاکستان میں اپنی حیثیت کا احساس ہوتا ہے۔“ [۳]

بلونت سنگھ بھی ایک ایسا ہی فنکار ہے جس کا تعلق پنجاب کے علاقے شیخوپورہ سے رہا۔ دوسرے ناولوں کے برعکس ان کے لکھے گئے ناول ”کالے کوس“ پر ناقدین نے وہ توجہ نہیں دی جس کا یہ ناول حق دار تہادیبی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، سید شبیر حسین اور غلام الثقلین نقوی کے ناول شامل ہیں لیکن دیہات کی سچی تصویر کشی پیش کرنے میں بلونت سنگھ کا ناول ”کالے کوس“ ان سے بہت آگے کی تخلیق ہے۔

”کالے کوس“ بلونت سنگھ کا ناول ہے جو کہ چھوٹی تقطیع پر ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ نیا ادارہ لاہور سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا یہ ناول تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا جو ہجرت اور فسادات کے دوران محسوس کیے گئے اور جھیلے گئے درد اور کرب کے لمحات کی تصویر کشی تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی اس ناول میں تقسیم سے پہلے کا پنجاب اور خصوصاً شیخوپورہ اور اس کے مضافات پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ناول کے تین حصے ہیں:

۱۔ میلہ: چل چلیے چڑک دے میلے منڈا تیرا میں چک لٹوں۔

۲۔ جھمیلہ: اج آکھاں وارث شاہ نوں (امرنا پریتم)

۳۔ ہولا: اسان وت نہ آن کے کھیڈنا ای (سید وارث شاہ)

ناول کی ابتدا سکھوں کے گوردوارے میں ان کی مذہبی عبادات کے مناظر سے ہوتی ہے۔ منظر گرمیوں کے بعد کے موسم کا ہے جہاں جاڑے نے ابھی مکمل طور پر موسم پر اپنی گرفت مضبوط نہیں کی تھی۔ ناول کے ابتدائی منظر سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ناول نگار کا مشاہدہ عمیق ہے، اس کی حسیات مکمل طور پر بیدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گوردوارے میں مذہبی عبادت کا منظر پوری آب و تاب کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔

بلونت سنگھ نے جہاں ایک طرف گرنٹھی جی کی مترنم آواز میں اشلوک پڑھنے کا منظر بیان کیا ہے وہیں انہوں نے پرشاد کے انتظار میں بیٹھے بچوں کی طبیعتوں کے اوب جانے کا منظر بھی خوبصورتی کے ساتھ عکس بند کیا ہے۔ منظر کتنا حقیقی ہے دیکھیے:

”برگد کے بوڑھے پیڑ کے چوڑے چوڑے پتے تالاب کے سبز گوں پانی پر تیر تیر کر ایک گوشے میں جمع ہو گئے تھے۔ ان پتوں کے نیچے سے موٹے مینڈک اُبلے اُبلے آنکھوں سے ان نٹ کھٹ بچوں کو دیکھ رہے تھے۔ جب بچوں نے انہیں دیکھا تو مٹی کے ڈھیلوں اور اینٹوں کے ٹکڑوں سے ان کی تواضع کرنے لگے۔ ڈھیلوں اور مینڈکوں کی غڑاپ غڑاپ کے شور سے بچے خوش ہو کر تالیاں پیٹنے لگے۔“ [۴]

بلونت سنگھ کا چونکہ مشاہدہ عمیق ہے اور وہ چیزوں کو گہرائی سے دیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے اس ناول میں انہوں نے اپنی اس صلاحیت کا بار بار استعمال کیا ہے۔ خصوصاً سراپا نگاری کے ذیل میں ان کی یہ غیر معمولی بصیرت جلوہ افروز ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار ”درسا سنگھ“ کا سراپا دیکھیے کتنی عمدگی سے بُنا ہے:

”خو خال تیکھے اور دلکش، ناک ضرورت سے کچھ زیادہ لمبی تھی پھر بھی اس کے چہرے پر بری نہیں لگتی تھی۔ نتھنے حساس ہونٹ اور منہ کا دہانا ایسا کہ عورتیں دیکھ کر پھڑک جائیں۔ آنکھوں سے کبھی معصومیت ٹپکنے لگتی اور کبھی مکاری۔ رنگ کھلتا ہوا بادامی۔“ [۵]

درسا سنگھ کے کردار کی کمزوریوں اور کجی کی طرف بلونت سنگھ نے عمدگی سے اشارہ کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے درسا سنگھ کی اس خوبی کی طرف بھی اشارہ کیا کہ وہ کبھی کسی لڑکی طرف خود نہیں گیا۔ بلونت سنگھ سراپا نگاری کے ماہر ہیں۔ درسا کے ساتھی سچا سنگھ گیٹا کا سراپا دیکھیے:

”نام تھا سچا سنگھ گیٹا، گیٹا یعنی چھوٹا لیکن سخت پتھر۔ قد پست گردن موٹی گدی پر چربی کی موٹی تہ اور بال جیسے گھوڑے کی ایال۔ اس کے دانت میلے اور مسوڑھوں میں مضبوطی سے جڑے تھے۔ ماتھا تنگ آنکھیں چھوٹی لیکن تجسس ایسا لگتا تھا کہ جیسے قادر مطلق نے سرمئی رنگ کی گیلی اور گندھی ہوئی مٹی کے تودے کو اپنے ہاتھ میں لے کر کھینچ کھانچ کر منہ پر ایک مروڑ دے کر چھوڑ دیا ہو۔“ [۶]

گوردوارے میں عبادت کے بعد پرشاد کا انتظار کرتے بچوں کی تفصیل دینے کے بعد بلونت سنگھ نے درس سنگھ کی آمد کا تذکرہ کیا تو پھر درس سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا مکمل سراپا اور ان کی خوبیوں کی تفصیل بیان کی۔ ناول کی ہیروئن ”گوبندی“ کا سراپا بھی بلونت سنگھ نے عمدگی سے تراشا ہے:

”وہ آسمان کی وسعتوں میں اڑنے والی کونج کے مانند حسین، نازک اور طرح دار تھی۔ جب اس کی سیاہ پٹلیاں گھنے بادلوں کی سی پلکوں کے سائے تلے ادھر ادھر حرکت کرتیں تو اس کی آنکھوں کے گوشے تیز دھار والے خنجر سے نظر آنے لگتے تھے۔ اس کے حساس پھڑکتے ہوئے ہونٹ ہر دم سحر پہونکنے پر آمادہ رہتے تھے۔ چکنے اور نرم رخساروں کے دلکش ابھاروں پر مچلتی ہوئی قدرتی سرخی پلکوں کی سرمئی چھائوں تلے عجب بہار دکھاتی تھی۔ کمہار کے اوندھے پڑے ہوئے کچے آبخوروں کی مانند اس کی چھاتیاں انگیا کے سہارے سے بے نیاز قدم قدم پر لرزاں سی دکھائی دیتی تھیں۔ باریک کرتے تلے ان کی سرکشی کو چھپانے کے لیے اس نے جامنی رنگ کی اوڑھنی کی دھری تہ تان دی تھی۔“ [۷]

اس اقتباس میں جہاں بلونت سنگھ کے مشاہدے کی گہرائی جولانیاں بکھیرتی محسوس ہوتی ہے وہیں ان کی حس جمالیات اپنے پورے جوہن پر پہنچتی ہوئی اس دور کی رومانی فضا اور ماحول کو قاری کی نگاہوں کے سامنے وا کر رہی ہے۔ بلونت سنگھ کے اسلوب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ناول کی ابتدا میں ضلع شیخوپورہ کے چار گائوں (مانگٹ، رتہ، چک ماگھ اور پھلاں) کے مناظر اور رسم و رواج کو جمالیاتی انداز بیان اختیار کر کے اس طرح بیان کیا ہے کہ ہر منظر زندہ اور متحرک ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ منظر دیکھیے:

”یہاں سے چار گائوں اور ان کے آس پاس میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت اور کھیتوں میں جا بجا روں روں کرتے ہوئے رھٹ صبح کے نور میندمکتے ہوئے پانی کے جوڑ، شیشم، پھلاہ اور ببول کے پیڑوں کے سائے عجب بہار دکھا رہے تھے۔“ [۸]

پنجاب کے رھٹ خصوصاً پھلاں کے رھٹ کی تصویر کشی بلونت سنگھ نے عمدگی سے کی ہے۔ انداز سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ قاری کو ثقیل اور ادق الفاظ کے گورکھ دھندے میں نہیں پھنساتے بلکہ انتہائی سادگی سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ انہوں نے پھلاں کے رھٹ کی عکس بندی کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں لگنے والے روایتی میلہ کی سنگت کی عکس بندی بھی خوبصورتی سے کی ہے۔ پھلاں والے پیر کی درگاہ کے منظر نے اکیسویں صدی کی درگاہوں پر نام نہاد پیروں کے کارناموں کی یاد تازہ کر دی۔ [۹] ناول کا ایک ذیلی موضوع معرفت الہی ہے جس کا نمائندہ بیلی جولابا ہے۔ بلونت سنگھ سراپا

نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے اس کمال فن کا اظہار انہوں نے بیلی کے سراپا تراشنے میں بھی دکھایا ہے:

”سر کے لمبے پٹے اس کی پتلی اور کچھ خمیدہ گردن کو چھپائے رکھتے تھے۔ مونچھوں کے بال لمبے اور چھدرے تھے۔ داڑھی بکرے کی طرح محض ٹھوڑی پر اُگی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں صورت مضحکہ خیز تھی۔“ [۱۰] ناول کے اہم کرداروں میں پشورا سنگھ اور میاں دل محمد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ چار گائوں کے یہ دو اہم کردار سکھ مت اور اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ناول کی کہانی روانی سے آگے بڑھتی ہے۔ بلونت سنگھ نے تقسیم ہند سے قبل کے ضلع شیخوپورہ کی دیہاتی زندگی کے رسم و رواج اور سماجی و معاشی اور سیاسی و تاریخی پس منظر کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے عام فہم انداز میں تحریکِ پاکستان کے مناظر کو شامل کر کے ہندو مسلم اور مسلم سکھ فسادات کی طرف ناول کے بیانیے کا رخ موڑ دیا۔

پشورا سنگھ اور میاں دل محمد دو الگ الگ مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود گہرے دوست ہیں۔ مسلمانوں کی مہمان نوازی کی خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے ساتھ بلونت سنگھ نے سکھ مذہب کی نمایاں خوبی مہمان نوازی کا تذکرہ بھی عمدگی سے کیا ہے۔

بلونت سنگھ کے اس ناول میں ترقی پسند سوچ کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اس سوچ کی نمائندگی پشورا سنگھ کا نوجوان بیٹا سورت سنگھ کر رہا ہے۔ جس نے بمبئی اور لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ وہ انسانیت کی خدمت کا خواہاں ہے اور سکول، ہسپتال اور لائبریریاں بنانے کا حامی ہے۔ اس کام میں اس کی مددگار اس کی محبوبہ مہندر کور ہے جس کا تعارف کچھ اس انداز میں بلونت سنگھ نے کرایا ہے:

”وہ گندم گوں جلد والی حسین لڑکی تھی۔ سدا کھدر پہنتی اور ہر قسم کے فیشن اور بنائو سنگھار سے دور رہتی تھی۔ اس کے آفتابی چہرے کے خط و خال سبک لیکن بہت پر کشش تھے۔ منہ کا دھانا چھوٹا، سبک ناک اور تنگ نتھنے تھے۔ اس کی چوہیا کی طرف ننھے ننھے دانت جو موتیوں کی طرح چمک دار تھے گہرے بھورے بال بہت طویل نہ سہی لیکن بے حد گھنے ضرور تھے۔“ [۱۱] بلونت سنگھ کی نثر میں اختصار کی بجائے طوالت کا پہلو بہت نمایاں ہے وہ واقعے کی پوری تفصیل بہم پہنچاتے ہیں۔ جس کی مثال گائوں میں ہونے والی ڈکیتی کی واردات ہے جس کی ایک ایک جزو سے انہوں نے قاری کو آگاہ کیا ہے۔

جہاں تک بات رومانویت کی ہے تو اس ناول میں تین تین کہانیاں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ گوبندی اور درسا کی محبت ناول کا سب سے اہم موضوع ہے جو ناول کے ابتدائی حصے پر محیط ہے اور پھر فسادات اور ہجرت کے کرب میں بھی یہ بیانیے کا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صورت سنگھ اور مہندر کور اور ریشماں اور سلطان کی پاکیزہ محبت بھی ناول کے متن کا حصہ ہے۔ بلونت سنگھ رومانوی مناظر کی تخلیق میں مکمل فنی مشاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔

یوں تو ناول کا پلاٹ مربوط ہے کہانی اتنی روانی سے آگے بڑھتی ہے کہ قاری کہانی کے بیانیے میں کھوسا جاتا ہے اور کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ لیکن ایک مقام ایسا ضرور آیا ہے جہاں بلونت سنگھ کے قلم کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ چوک گئے۔ درسا، سراج کا بہت قریبی دوست ہے

اور ریشماں سراج کی بہن ہے تو وہ درسے کی بھی بہن ہوئی۔ اس حوالے سے ریشماں درسے کو بھائی کہتی نہ کہ چاچا۔ بلونت سنگھ نے ریشماں کی زبانی درسا کو چاچا کہلویا ہے جو کہ درست نہیں اور بلونت سنگھ کا خیال بھی اس کی اصلاح کی طرف نہیں گیا:

”ماں بھی ادھر ادھر ہو گئی اور سراج بھی کسی کام سے پچھوڑے والے کمرے میں چلا گیا تو اکیلے رہ جانے پر درسا ریشماں کی ٹھوڑی پر دو انگلیاں رکھ کر بولا: ”ریشماں رانی! ذرا ادھر تو دیکھ چاچے کی طرف۔“ [۱۲]

بلونت سنگھ نے جہاں درسے کی بہت سی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے وہیں اس کی خوبیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ درسا خود ازار بند کا ڈھیلا ہے لیکن کریمو کے عورتوں کی خریدو فروخت جیسے پیشے سے منسلک ہونے کو برا خیال کرتا ہے۔ بلونت سنگھ کا کمال فن ہے کہ انہوں نے ناول میں رومانویت کی جس لہر کو متعارف کرایا ہے وہ قابلِ داد تو ہے ہی قابلِ دید بھی ہے۔ گوبندی دل و جان سے درسے پر فریفتہ ہے لیکن درسا اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس بیلا جیسی بدقماش لڑکی پر وہ دل و جان سے فدا ہے۔ بلونت سنگھ نے اس ازلی ارضی اصول کی تشریح بہت عمدگی سے کی ہے کہ نفی اور نفی مل کر جمع ہو جاتے ہیں۔ درسے کو غلط کاموں سے نیکی کی طرف راغب کرنے میں بیلا کے منفی کردار کا بہت ہاتھ ہے۔ بیلا کی بے وفائی کی وجہ سے درسے نے غلط کام چھوڑے اور صدق دل سے گوبندی کی طرف راغب ہوا۔ بلونت سنگھ نے فنکارانہ مہارت سے اس تمام اصول کو ڈرامائی ٹچ دیا۔ یوں رومانویت کا یہ المیہ، طریقہ میں تبدیل ہوا۔ یہیں سے ناول کی کہانی میں تحریکِ پاکستان کا عنصر شامل ہوا اور بلونت سنگھ نے تاریخی شعور کی چاشنی سے ناول کی زمین کو سیراب کر دیا۔

بلونت سنگھ کے ہاں غیر جانبداری کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کی حمایت یا جانبداری میں تعصب سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے والے مفاد پرست سیاستدانوں کا کچا چٹھا پوری ادبی دیانتداری کے ساتھ فاش کیا ہے۔ یہاں کھیم چند ایسے مفاد پرستوں کا نمائندہ ہے جو بے پر کی اڑاتا ہے اور سادہ لوح بندوٹوں اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا ہے۔ [۱۳] کریمو کو درسے سے بیر تھا کیونکہ درسا اس کی خریدی ہوئی عورت کو بھگا لایا تھا چنانچہ اسی بغض کو سامنے رکھ کر کریمو نے چار گائوں کے مسلمانوں کو اس کے خلاف بہکایا۔ بلونت سنگھ نے اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر قوم کو اجتماعی خود کشی کی طرف دھکیلنے والے ابن الوقت مفاد پرستوں کے چہرے سے نقاب عمدگی سے اتارا ہے۔ بلونت سنگھ نے چار گائوں میں ہونے والے فسادات میں پہلی اینٹ کا کردار ادا کرنے والے واقعے کی تفصیل اتنی دلگدازی کے ساتھ دی ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ [۱۴] ناول کے منفی کرداروں میں کریمو، چودھری برکت علی، ماسٹر چانن لال، بیڈ ماسٹر سورج سنگھ، اور کھیم چند شامل ہیں۔ ہر برے کام میں پیش پیش درسا سنگھ بعد میں بہادری اور جرأت کی علامت کے طور پر ناول میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ بلونت سنگھ کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق اور بات کو بیان کرنے کا ہنر بے مثل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ناول کے مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے میں اتنی مہارت سے پیوست کیا ہے کہ بے

ساختمہ کملہ تحسین زبان سے ادا ہو جاتا ہے۔ ضلع شیخوپورہ کے دیہات کے مناظر کی عکس بندی، دیہاتی میلوں کی تفصیل اور گوبندی کا درسے سے عشق پہلے حصے پر مشتمل ہے۔ دور سے حصے میں صورت سنگھ اور مہندر کور کی شکل میں ناول میں ترقی پسند سوچ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ساتھ ہی تحریک پاکستان کا ذکر اور درسے کے ساتھیوں کا ضلع شیخوپورہ کے تھانہ میں مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں مظلومانہ قتل اور اس قتل سے کریمو جیسے ناہنجر کی درسے سے ذاتی پرکاش رکھنے کے عوض ذاتی مفاد حاصل کرنے کی خاطر ہندو سکھ اور مسلم فسادات کے لیے خشت اول کا مکروہ کردار ادا کرنے کی کوشش ناول کے دوسرے حصے کا بیانیہ ہے جسے بلونت سنگھ نے مکمل فنی مہارت سے صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

مختلف ادوار میں ایک ہی بندے کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔ اس بات کو درسے کے متنوع کردار کے ذریعے بلونت سنگھ نے بیان کیا ہے۔ بیلا کے منفی کردار کی وجہ سے درسے گوبندی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ صورت سنگھ اور مہندر کور کی گائوں والوں کے لیے کی گئی بھلائی کی کاوشوں کا مخالف درسے، مہندر کور کی خوش اخلاقی اور زخمی حالت میں ہونے پر مہندر کور کی تیمارداری کی وجہ سے تبدیل ہو کر ان کا ساتھی بن جاتا ہے اور کریمو کے گھٹیا رویے اور اپنی ہزیمت کا بدلہ عام مسلمانوں اور سکھوں سے لینے کی کوشش کرنے پر مسلمانوں اور سکھوں کا مسیحا بن کر سامنے آتا ہے۔

پورے ناول میں بلونت سنگھ کا فن عروج پر ہے۔ وسیع کینوس کا ناول ہونے کے باوجود بلونت سنگھ نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ تحریک پاکستان کے تناظر اور شیخوپورہ میں سکھوں کے مظلومانہ قتل کے بعد سکھوں میں رنج و غم کے احساسات اور اس کے برعکس مسلمانوں خاص طور پر سادہ لوح مسلمانوں کو کریمو اور چودھری برکت علی جیسے پست کردار لوگوں کی مذہب کی غلط توجیح کر کے انہیں غلط راستے پر لگا دینے کی کاوش اور میاں دل محمد جیسے پاکباز آدمی کی معاملے کو سلجھانے کی کاوشوں کو بلونت سنگھ نے خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

بلونت سنگھ نے تمام حالات کا تجزیہ غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے تمام تر صورتحال کا ذمہ دار لیڈروں کو ٹھہرایا۔ بلونت کو اپنی مٹی سے عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بٹوارہ کی صورت حال کو انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ یہ اقتباس دیکھیے:

”لیڈروں کی لیڈری کا مزہ تو تب جب ان غریبوں کی بھلائی ہو۔ ان کے حالات میں سدھار ہو۔ اس کے بجائے اگر ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے تو ایسے لیڈروں کا اور ان کی لیڈری کا فائدہ کیا؟“ [۱۵]

چودھری برکت علی اور کریمو جیسے کردار تلخ حالات میں اپنی مفاد پرست سوچ کی وجہ سے سادہ لوح عوام کی بربادی کا باعث بنتے ہیں تو میاں دل محمد جیسے کردار اپنی ثابت قدمی کی وجہ سے سرخرو ہو جاتے ہیں۔ یہ اقتباس ان دونوں کرداروں کی سوچ کی واضح طور پر عکاسی کر رہا ہے:

”چودھری صاحب! میں آپ کو سنجیدہ اور سوچ بوجھ والا آدمی سمجھتا تھا، لیکن افسوس! آپ کا کٹ ملا پن نہ گیا۔ عقل مندوں نے کہا ہے کہ پہلے تولو اور پھر بولو۔ آپ عقل مند انسان ہوتے تو آپ یہ سب کچھ کہنے سے پہلے محسوس کر لیتے کہ آپ کے ان زہریلے الفاظ کا بھولے بھالے مسلمانوں پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔“ [۱۶]

بدلتے حالات کے حالات کے تناظر میں سکھوں اور ہندوئوں کی پیش بندی، ہیڈ ماسٹر سورج سنگھ، کہیم چند اور چانن لال کی گھٹیا سوچ، درس اور پشورے کی دور بینی اور مسلمانوں کی اجتماعی بھلائی کی کاوشوں کا تذکرہ بلونت سنگھ نے عمدگی سے کام کیا ہے۔ کریمو کے میاں دل محمد کے بیٹوں کے ہاتھوں بری طرح پٹنے کے بعد دوسرے علاقے کے مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف کرنے اور سکھوں کو مارنے کے لیے جتنہ بند شکل میں حملہ کرنے اور درس سنگھ کے سپہ سالار کا کردار ادا کرنے اور پشورہ سنگھ کے ساتھ میاں دل محمد اور عام سادہ لوح مسلمانوں کے اتحاد کے مناظر کو جس عمدگی کے ساتھ بلونت سنگھ نے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، پڑھتے ہوئے آنکھوں کے سوتے ساون کی جھڑی کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں۔ یہ بلونت سنگھ کے کمال فن کا بین ثبوت ہے کہ وہ قاری کو المیے کو خود پر طاری کرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

بلونت سنگھ کا ایک اور کمال بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ جاری صورتحال میں سے اچانک بدلائو لاتے ہیں اور کرداروں کو اس کے برعکس صورت حال میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ جنگ کے مناظر درس سنگھ کی سوچ میں تبدیلی لاتے ہیں تو اسے گوبندی کا خیال آتا ہے۔ وہ اس سے معافی مانگنے چلا جاتا ہے۔ درس اور گوبندی کی اس ملاقات کا منظر اتنا دلکش اور حقیقت کے اتنا قریب ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتا ہے:

”گوبندی کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی۔ درس ہڑبڑا کر کہنے لگا۔ ’جلدی بولو۔ میں اس طرح کب تک لٹکا رہ سکتا ہوں؟۔۔۔ گوبندی رانی! منڈیر چھوٹی ہے۔۔۔ میرے ہاتھ پھسلے جارہے ہیں۔ گوبندی کے نتھنے پھڑکے اور حساس ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس کا دل بھر آیا اور کالی کالی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔ ادھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر درسے کے ہاتھوں پر گرے اور ادھر اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، پھر پلک جھپکتے میں اس کی چوڑی کلائیاں گوبندی کے ہاتھوں سے پھسل گئیں۔“ [۱۷] فسادیونکے حملوں کے پیش نظر ہندوئوں اور سکھوں کو ریفوجی کیمپ منتقل کر دیا گیا۔ رخصت کے وقت جو الم ناک مناظر دیکھنے کو ملے وہ شقی القلب انسانوں کے علاوہ باقی سب کا ہوش و حواس چھین لینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ [۱۸] ریفوجی کیمپ میں ہندوئوں اور سکھوں کا اگٹھ، کیمپ میں عورتوں اور بچوں کی بے بسی اور بے کسی، گاڑی کا انتظار، درس کا اپنے گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ ٹرکوں سے امرتسر جانے اور پشورے کا انکار، گاڑی کے آنے کا منظر، مسافروں کی دھینگا مشتی، چالیس پچاس مسافروں کی جگہ دو دو سو مسافروں کا ڈبے میں گھس جانا، باقیوں کا کھڑکیوں، دروازوں پر لٹک جانا اور چھت پر بیٹھ جانے کا منظر، ٹرین کے غیر معروف اسٹیشن پر رکنے اور وہاں مسلمانوں کے گروہ کا جمع ہو جانے کا منظر اور ہندوئوں اور سکھوں میں سراسیمگی پھیل جانے کے مناظر کی عکس بندی بلونت سنگھ نے اتنی مہارت سے کی ہے اور یہ تمام مناظر اتنے

حقیقی ہیں کہ قاری کے لیے وقت جیسے تھم سا جاتا ہے اور وہ ۲۰۱۷ء میں ہوتے ہوئے بھی ۱۹۴۷ء کے کربل مینجا موجود ہوتا ہے۔

انسانی ہجرت کا ایسا تلخ اور حقیقت سے پُر بیانیہ بہت کم منظر عام پر آیا ہے جس میں اتنی تاثیر ہو کہ بیٹھے بیٹھے قاری کی ساری حسّیات کو اپنی لپیٹ میں لے کر قاری میں جانکنی کی کیفیت پیدا کر دے۔ یہ تخلیقیت کی بلند تر سطح ہے اور بلونت سنگھ اس ستائش کے حقدار ہیں۔ انہوں نے جہاں نیکو کاروں کے پردے میں بُرے لوگوں سے متعارف کرایا ہے وہیں منفی خصوصیات کے حامل افراد میں ایسی ایسی بھلائی والی خوبیاں ڈھونڈ نکالی ہیں کہ زبان پر بے ساختہ تحسین کے کلمات آجاتے ہیں۔

اسٹیشن پر بلوائیوں کے موجود ہونے کا منظر، امرتسر سے مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر مشتمل ٹرین کے تمام مسافروں کا بہیمانہ قتل اور اس کے بعد لاہور کے معروف اسٹیشن پر ہندوئوں اور سکھوں کے خون سے ہولی کھیلتے مسلمان فسادیوں کی خون ریزی کا احوال اور اسی تناظر میں کریمو جیسے گھٹیا آدمی کا ذاتی مفاد اور گوبندی کو اغوا کر کے لے جانے کا منظر، یہ تمام مناظر بلونت سنگھ نے دلدوزی کے ساتھ تخلیق کیے ہیں۔ ایک ایک منظر ایسا ہے کہ پڑھنے کے بعد مزید آگے پڑھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں بلونت نے کریمو جیسے فسادیوں کو دکھایا ہے وہیں ایسے مسلمان کردار بھی متعارف کرائے ہیں جو مشکل کی اس گھڑی میں جہاں موت سر پہ کھڑی نظر آرہی ہے پھر بھی اپنے بندو اور سکھ بھائیوں کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کے ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ درس اور اس کے ساتھیوں کو سرحد پار کرانے کا مشکل بیڑا اٹھانے والے ان کے جگری دوست مسلمان ہی تھے جنہوں نے مسلک اور مذہب سے بالا تر ہو کر خونیں حالات میں بھی دوستی اور وفا کی لاج رکھی۔

بلونت سنگھ نے ایک طرف مسلمان فسادیوں کے ہندوئوں اور سکھوں پر ڈھائے جانے والے مناظر کی تصویر کشی کی تو دوسری طرف ہندوئوں اور سکھوں کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم کو بھی اسی دلدوزی کے ساتھ بیان کیا۔ جب درس سنگھ اپنے کانڈان کے ساتھ ہند یونین کے شہر امرتسر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ:

”گلی کوچوں میں پاکستان سے بھاگے ہوئے لوگ چیونٹیوں کی طرح پھر رہے تھے۔ ایک بھی مسلمان کی صورت نظر نہیں آئی ان کے مکان اور محلے جلا دیئے گئے تھے۔“ [۱۹]

ظلم و بربریت کے بازار گرم بینلیکن ایک عاشق اپنی محبوبہ کے فراق میں گم ہے۔ بلونت سنگھ نے جہاں فسادات کے مناظر کی دلدوزی سے تصویر کشی کی ہے وہیں آگ اور خون کے گرم بازاروں میں محبت کے کھلتے کنول کے شیدائی درسے کو گوبندی کے فراق میں تڑپتا یوں دکھایا ہے کہ اپنی محبت کے حصول اور تلاش میں گم درسے کو آگ اور خون کے بازار سے گزرتے دکھایا ہے اور کمال کر دیا ہے۔ [۲۰] یہ سچ ہے کہ ڈھونڈنے پر خدا بھی مل جاتا ہے لیکن اس کے لیے لگن اور عشق کا سچا ہونا لازمی ہے پھر وہ خود راستے بنا کر عاشق کو منزل مقصود پر لے جاتا ہے۔ بلونت سنگھ نے اسی بات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور کریمو جیسے بد طینت کے ہاتھوں گوبندی کو بے آبرو ہونے

سے بچانے والے میاں دل محمد جیسا زندہ کردار تخلیق کیا ہے جنہوں نے اپنے گائوں کی لاج رکھنے کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام کا تابندہ اور سچا روپ دنیا والوں کے سامنے آشکار کرایا۔ میاں دل محمد کی وجہ سے گوبندی کی نہ صرف عزت لٹنے سے بچ گئی بلکہ اس کی جان بھی بچ گئی۔ درسے کا عشق سلامت تھا اس لیے جب وہ آگ اور خون کے بازار سے گزر کر اپنے محبوب کے گائوں پہنچا تو اسے محبوب بھی زندہ سلامت مل گیا۔ بلونت سنگھ کے نرالے اور اچھوتے اسلوب اور انداز بیان کو جانچنے کے لیے یہ اقتباس پڑھیے:

”وہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ حسین اور ہوش ربا منظر دکھائی دیا۔ اس کی ہونے والی بیوی گوبندی، سرسوں کی طرح نرم و نازک اس کی آنکھوں کے سامنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ سرسوں کے تیل کا چراغ جل رہا تھا اور اس کی کپکپاتی روشنی میں وہ موم کی پتلی سی دکھائی دے رہی تھی۔“ [۲۱]

پشورہ سنگھ کی عدم موجودگی میں جس طرح میاں دل محمد نے اس کی بیٹی گوبندی کی عزت و جان کی حفاظت کی وہ اشک افروز ہے۔ درسے کے کردار کو بلونت سنگھ نے فنکارانہ مشاقی سے تراشا ہے۔ اپنی محبت کو کامیابی سے پا کر اور اسے اس کے والدین تک پہنچا کر اسے شاد کام ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ رکا نہیں بلکہ تازہ دم ہو کر اپنے جگری یار سراج کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تا کہ اسے بحفاظت وطن چھوڑ آئے۔ سراج کی تلاش، سراج کی بہن ریشماں کی بچپن کی محبت سلطان کی بازیابی اور پھر ان سب کو پاکستان صحیح سلامت پہنچانا درسے ہی کا کام تھا ان تمام واقعات کو بلونت سنگھ نے عمدگی سے الفاظ کا جامہ پہنایا کر صفحہ قرطاس پر بکھیرا۔

بلونت سنگھ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے طریقہ سے المیہ کشید کیا اور پھر المیے سے طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ آگ اور خون کی ندیاں پھلانگ کر درسا، پشورہ، گوبندی اور مہندر کور ہندوستان میں اور سراج، ریشماں، سلطان اور سراج کی ماں اور بیوی بحفاظت پاکستان پہنچ گئے۔ ناول کا اختتام دوستی اور وفا کی لاجواب سلامتی پر ہوا۔ یہ آخری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

”درسے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی جیسے پوچھ رہا ہو سراج! کیا تم مجھ سے ملنے پاکستان سے یہاں آئے ہو۔“ سراج نے اپنے اونچے قد کو اور بھی اونچا کیا اور ایک بار پھر اپنے سامنے کھڑے کڑیل کسان سے آنکھیں ملانیں اس کی گھنی مونچھیں پھڑکیں۔ اس نے درسے کا چوڑا چکلا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو: ”اھو (ہاں) درسیا!“ [۲۲]

ڈاکٹر محمد افضل بٹ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ”اردو ناول میں سماجی شعور“ کے موضوع پر ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تقسیم ہند کے تناظر میں لکھے خوں چکاں واقعات کی سچی عکاسی کرنے والے اس ناول ”کالے کوس“ کا تذکرہ ان کے مقالے میں شامل نہیں ہے۔ حالانکہ تقسیم ہند، فسادات، مہاجرین کے مسائل اور ہجرت کے تلخ تجربے کی جتنی سچی اور غیر جانبداری سے عکاسی بلونت سنگھ نے کی ہے اس کی مثال کسی اور ناول نگار کے ہاں نہیں ملتی۔

لسانی جائزہ:

لسانی حوالے سے بات کی جائے تو بلونت سنگھ نے ہائے دو چشمی کا استعمال پورے ناول میں کیا ہے جہاں ”ہوا“ لکھا ہے وہاں ”ہوا“ لکھا ہے۔ ”و“ کے اوپر ”ء“ بھی لگایا ہے [ص ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۲۱] ہنس ہنس کر کو ” ہنس ہنس کر“ لکھا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ہائے ہوز کی جگہ ہائے دو چشمی کا رواج تھا۔ ”تہ“ کو ”تہ“ لکھا ہے [ص ۱۶] تشبیہات کا استعمال:

ناول میں مختلف مقامات پر بلونت سنگھ نے تشبیہات کا بر محل اور بر جستنہ استعمال کیا جس کی وجہ سے ان کی نثر شاعرانہ حسن سے مملو ہو گئی چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ چنگاریاں اڑاتی ہوئی آسمان کی طرف اڑنے والی ہوائی کا سا اس کا قد تھا۔“ [ص ۱۰] یہاں درسا سنگھ کے قد کے بارے میں بتایا گیا۔
گیتا کی آنکھوں کا نقشہ اس طرح بیان کیا ہے:

۲۔ ”جیسے قادرِ مطلق نے سرمئی رنگ کی گیلی اور گندھی ہوئی مٹی کے تودے کو اپنے ہاتھ میں لے کر، کھینچ کھانچ کر منہ پر ایک مروڑ دے کر چھوڑ دیا ہو۔“ [ص ۱۴]
۳۔ ”کولہے بڑی نزاکت سے ناگ پھن کی طرح ادھر ادھر مٹکتے۔“ [ص ۱۸]
۴۔ ”وہ آسمان کی وسعتوں میں اڑنے والی کونج کے مانند حسین نازک اور طرح دار تھی۔“ [ص ۱۹]

۵۔ ”کمہار کے اوندھے پڑے ہوئے کچے آبخوروں کے مانند اس کی چھاتیاں انگیا کے سہارے سے بے نیاز قدم قدم پر لرزاں سی دکھائی دیتی تھیں۔“ [ص ۱۹]

۶۔ ”اس کے اوپر والے ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندوں نے موتیوں کی جھالرٹانگ دی۔“ [ص ۲۱]

۷۔ ”یوں لگتا تھا جیسے اس کے سرخ اور تاباں ہونٹوں پر کسی غیبی ہاتھ نے موتیوں کا تاج رکھ دیا ہو۔“ [ص ۲۱]

۸۔ ”اس نے ہلکے طوطیا رنگ کا تہبند باندھ رکھا تھا۔“ [ص ۱۱]
۹۔ ”اس کے چوہیا کی طرح ننھے ننھے دانت جو موتیوں کی طرح چمک دار تھے۔“ [ص ۳۹]

۱۰۔ ”اس کے گہرے نیلے پھیلاؤ میں پریوں کی راجکاری کی طرح بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے ادھر ادھر دوڑے جا رہے تھے۔“ [ص ۷۵]

۱۱۔ قریب ہی کھیتوں میں مٹیالے پانی کا جوہڑ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس میں پگھلا ہوا سیسہ بھرا ہو۔“ [ص ۷۵]

۱۲۔ جوہڑ کے کنارے اکیلا پیڑ کالے چور کی طرح سہماہوا سا کھڑا تھا۔“ [ص ۷۵]
۱۳۔ ”افق میں اونچے اونچے پیڑوں کے سلسلے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے راکششوں کی فوج کہیں ہلہ بولنے جا رہی ہو۔“ [ص ۷۵]

۱۴۔ ”وہ موم کی پتلی سی دکھائی دے رہی تھی۔“ [ص ۲۱۶]

محاورت کا استعمال:

بلونت سنگھ نے محاورات کا استعمال بھی برمحل کیا۔ چنس مثالیں ملاحظہ کیجیے:

- ۱۔ اس کی شکل و صورت دھوکے کی ٹٹی تھی۔ [ص ۱۱]
- ۲۔ حرامزادے کی رسی دراز ہوتی ہے۔ [ص ۱۳]
- ۳۔ اس نے اس قدر زور دار حملہ کیا کہ ساہنسی کے پیر اکھڑ گئے۔ [ص ۱۷]
- ۴۔ بھاری جوتوں کی دو ضربیں ایسی لگائیں کہ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ [ص ۱۷]
- ۵۔ اس واقعے نے تو اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ [ص ۱۷]
- ۶۔ سوچتی تھی شاید آنکھیں چار ہو جائیں۔ [ص ۲۱]
- ۷۔ اس کا باپ درسے سے بیاہ کی بات چلا کر منہ کی کہا چکا ہے۔ [ص ۲۱]
- ۸۔ اس نے چھپی چھپی نظروں سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش بھی کی۔ [ص ۲۱]
- ۹۔ افسوس اپنے ہاتھوں اپنے پائوں کلہاڑی مار رہا ہے۔ [ص ۲۱]
- ۱۰۔ درسو تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔ [ص ۲۲]
- ۱۱۔ اس کی گوبندی سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ [ص ۲۹]
- ۱۲۔ گوبندی نے گھر والوں کی آنکھ بچائی۔ [ص ۲۹]
- ۱۳۔ بے چاری گوبندی نے بہت چاہا کہ منہ سے کچھ کہے لیکن منہ کا تالا نہ کھل سکا۔ [ص

]۳۰

- ۱۴۔ اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ [ص ۴۲]
- ۱۵۔ گوبندی کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ [ص ۴۳]
- ۱۶۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ [ص ۴۴]
- ۱۷۔ منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے بولا۔ [ص ۵۱]
- ۱۸۔ لمحہ بھر میں اس کے حواس ہوا ہو گئے۔ [ص ۵۸]
- [آج کل ان معانی میں محاورہ اوسان خطا ہو گئے استعمال ہوتا ہے۔]
- ۱۹۔ کپورا چہرہ چھپائے، آنکھیں چرائے، ساتھیوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ [ص ۶۷]
- ۲۰۔ ان کا یہ راز کبھی وا نہیں ہو گا۔ [ص ۸۷]
- [آج کل راز فاش ہونا استعمال ہوتا ہے۔]
- ۲۱۔ بے پر کی گپیں اڑاتی رہیں۔ [ص ۹۸]
- ۲۲۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی امید پر اوس پڑ جائے۔ [ص ۱۰۵]
- [ارمانوں پر اوس پڑنا ہوتا ہے۔]
- ۲۳۔ درسے سے شادی کرنا گوبندی کو کنویں میں دھکیلنا ہے۔ [ص ۱۰۶]
- ۲۴۔ اس کے پائوں تلے سے زمین نکل گئی۔ [ص ۱۶۵]
- ۲۵۔ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوا۔ [ص ۱۷۱]
- ۲۶۔ کچھ لوگ تو اسے بے پر کی سمجھ کر اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔ [ص ۱۷۲]
- ۲۷۔ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد [ص ۱۷۴]

- ۲۸۔ وہ بھی درسے کو دیکھ کر سکتے میں آگئی۔[ص ۲۱۶]
- ۲۹۔ اس کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھے۔[ص ۲۱۶]
- ۳۰۔ اور چشمِ زدن میں درسے کے گلے کا ہار بن گئی۔[ص ۲۱۶]
- املا کی غلطیاں:
- ۱۔ اس کی موجودگی علاقے بھر کے خطرے کی علامت تھی۔[ص ۱۱۳]
- علاقے بھر کے ”لیے“ درست ہے۔
- ۲۔ درساً سنگھ دیدہ دانستہ یا نادیدہ دانستہ اس کی طرف توجہ دینے بغیر ہی آگے بڑھ گیا[ص ۲۱]
- ۳۔ لڑکی کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔[ص ۶۶]
- رنگ فق ہونا درست ہے۔
- ۴۔ ابھی وہ مکان کے کچھ دور ہی تھا۔[ص ۸۳]
- ”مکان سے“ درست ہے
- ۵۔ وہ ٹھہری کل کی چھو کری۔[ص ۸۶]
- ٹھہری درست ہے
- ۶۔ بیلا درسو کی کروٹ میں کھڑی تھی۔[ص ۹۴]
- اوٹ میں درست ہے۔
- ۷۔ بات سے بات نکالنا ان کے بوتے کا نہیں تھا۔[ص ۹۵]
- ان کے بس کا نہیں تھا درست ہے
- ۸۔ بیلا سے اس کے تعلقات گویا کفن میں آخری کیل کا کام کر رہے تھے۔[ص ۹۸]
- تابوت میں آخری کیل درست ہے۔
- ۹۔ آپ کی آنکھوں میں دھول ڈال کر آئے[ص ۱۱۲]
- آنکھوں میں دھول جھونکنا درست ہے۔
- ۱۰۔ گادھی[ص ۱۱۶] درست لفظ گدھی ہے
- ۱۱۔ میں تو اب بھی یہی سمجھتا سکتا ہوں[ص ۱۲۹]
- سمجھا سکتا ہوں درست ہے
- ۱۲۔ کیا کہیں میاں ہی[ص ۱۳۲] درست میاں جی ہے
- ۱۳۔ سنہرے موقعے[ص ۱۶۰] سنہری مواقع درست ہے
- ۱۴۔ قصیم[ص ۱۶۱] درست لفظ قصہ یا قضیہ ہے
- ۱۵۔ فسادیوں کی مدد پر[ص ۱۶۱] درست لفظ مدد کو ہے
- ۱۶۔ گائوں کے مسلمانوں نے تو پریشان تو نہیں کیا۔[ص ۱۶۳] ایک تو زائد ہے
- ۱۷۔ جو ہونا ہے سو تو ہو کر ہی رہے گا[ص ۱۷۸]
- سو کی جگہ وہ ہونا چاہیے
- ۱۸۔ اب ہم تو نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔[ص ۱۸۴]

تو نہ کی جگہ نہ تو ہونا چاہیے

۱۹۔ دونوں دیسوں کے گیت گلے رہے ہیں [ص ۲۳۶] گلے مل رہے ہیں درست ہے۔

پنجابی الفاظ کا استعمال:

بلونت سنگھ نے ناول میں کچھ مقامات پر پنجابی کے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ ان میں تین

مقامات تو وہ ہیں جہاں انہوں نے عنوانات قائم کیے ہیں جیسے

۱۔ میلہ: چل چلیے چڑک دے میلے منڈا تیرا میں چک لٹوں۔

۲۔ جھمیلہ: اج آکھاں وارث شاہ نوں (امرنا پریتم)

۳۔ ہولا: اسان وت نہ آن کے کھیڈنا ای (سید وارث شاہ)

اس کے علاوہ چار اور مقامات پر بھی پنجابی کے الفاظ استعمال کیے ہیں جیسے

۴۔ اوان داڑھیا منڈا کتھے گیا اے [ص ۱۱۷]

وہ بغیر داڑھی والا لڑکا کہاں گیا

۵۔ نہ ونج نہ ونج [ص ۹۹]

نہ جائو نہ جائو

۶۔ ٹک پو اتھائیں وے [ص ۹۹]

یہیں ٹھہر جائو

۷۔ آھو [ص ۲۳۸]

بانبولونت سنگھ کی نثر کی بات کی جائے تو زبان سادہ اور سلاست سے بھر پور ہے۔ انہوں نے عام فہم انداز میں ہجرت اور فسادات کے کرب کو بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تقسیم سے پہلے کے پنجاب خصوصاً شیخوپورہ کا دیہاتی پس منظر اپنی پوری رعنائی کے ساتھ بیان کیا۔ ہجرت، فسادات اور توسیم کے دلدوز مناظر پوری غیر جانبداری اور تعصب سے بالاتر ہو کر حقیقت نگاری سے لیس پُر اثر اسلوب میں بیان کیے۔

دوسری بات اس ناول کی جو سب سے اہم خوبی ہے وہ اس کا رومانس ہے۔ بلونت سنگھ نے رومانی مناظر کی عکس بندی دلربا پانہ انداز سے کی ہے۔ خصوصاً اعضائے نسوانی کی تصویر کشی تو بہت عمدہ ہے جہاں انہوں نے دلپذیر تشبیہات کا استعمال عمدگی سے کیا۔ خصوصاً گوبندی کی آنکھوں، ہونٹ اور سینے کی عکس بندی بہت عمدہ ہے۔ سراپا تراشنے کے ہنر سے آشنا بلونت سنگھ نے ناول کے تمام اہم کرداروں کی سراپا نگاری کی تراش خراش میں حقیقت نگاری سے کام لیا۔ یہی نہیں بلکہ جو کردار تھوڑی دیر کے لیے ناول میں جلوہ گر ہوئے ان کی تصویر کشی بھی بلونت سنگھ نے اتنی عمدگی سے کی کہ وہ ان مٹ نقش چھوڑ گئے جیسے بیلی شاہ، اس کی بیٹی کولان، مسلمان ڈرائیور بگو ساہنسی اور شرلی وغیرہ۔

ناول کے مرکزی کردار درسا سنگھ، گوبندی، میاں دل محمد، پشورہ سنگھ، سراج، ریشمان، مہندر کور، صورت سنگھ اور سلطان کے تذکرے بھی اتنی عمدگی سے ہوئے کہ یہ کردار زندگی سے بھرپور دکھائی دیئے۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ ناول جہاں ایک طرف عظیم انسانی ہجرت اور فسادات

کے تناظر میں حقیقت نگاری کی لہر لیے ایک عظیم ناول ہے۔ وہیں رومانویت کے پس منظر میں بھی دیکھا جائے تو بلونت سنگھ کی نثر لاجواب ہے۔ انہوں نے رومانی مناظر کی تصویر کشی تشبیہاتی مدد سے بہت عمدگی سے کی ہے۔

فکری و فنی ہر دو لحاظ سے یہ ایک مکمل، زندہ اور جاندار ناول ہے۔ اس کے کردار درسا، گو بندی، سراج، گیٹا، پشورہ سنگھ، مہندر کور، میاں دل محمد اور صورت سنگھ کے ساتھ ساتھ کریمو جیسے کردار بھی اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

حوالہ جات:

- ۱) عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم، دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہائوس، ۱۹۸۷ء ص ۸
- ۲) محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۷
- ۳) شہزاد احمد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، کراچی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اگست ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۷
- ۴) بلونت سنگھ، کالے کوس، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۸ء، ص ۹-۱۰
- ۵) کالے کوس، ص ۱۱
- ۶) ایضاً، ص ۱۴
- ۷) ایضاً، ص ۱۹
- ۸) ایضاً، ص ۲۳
- ۹) ایضاً، ص ۲۵
- ۱۰) ایضاً، ص ۳۱
- ۱۱) ایضاً، ص ۳۹
- ۱۲) ایضاً، ص ۸۹
- ۱۳) ایضاً، ص ۱۰۹
- ۱۴) ایضاً، ص ۱۲۲
- ۱۵) ایضاً، ص ۱۳۶
- ۱۶) ایضاً، ص ۱۳۸
- ۱۷) ایضاً، ص ۱۵۹
- ۱۸) ایضاً، ص ۱۶۵
- ۱۹) ایضاً، ص ۲۰۰
- ۲۰) ایضاً، ص ۲۰۸
- ۲۱) ایضاً، ص ۲۱۶
- ۲۲) ایضاً، ص ۲۳۸

/...../